جیون دھارا

ناول

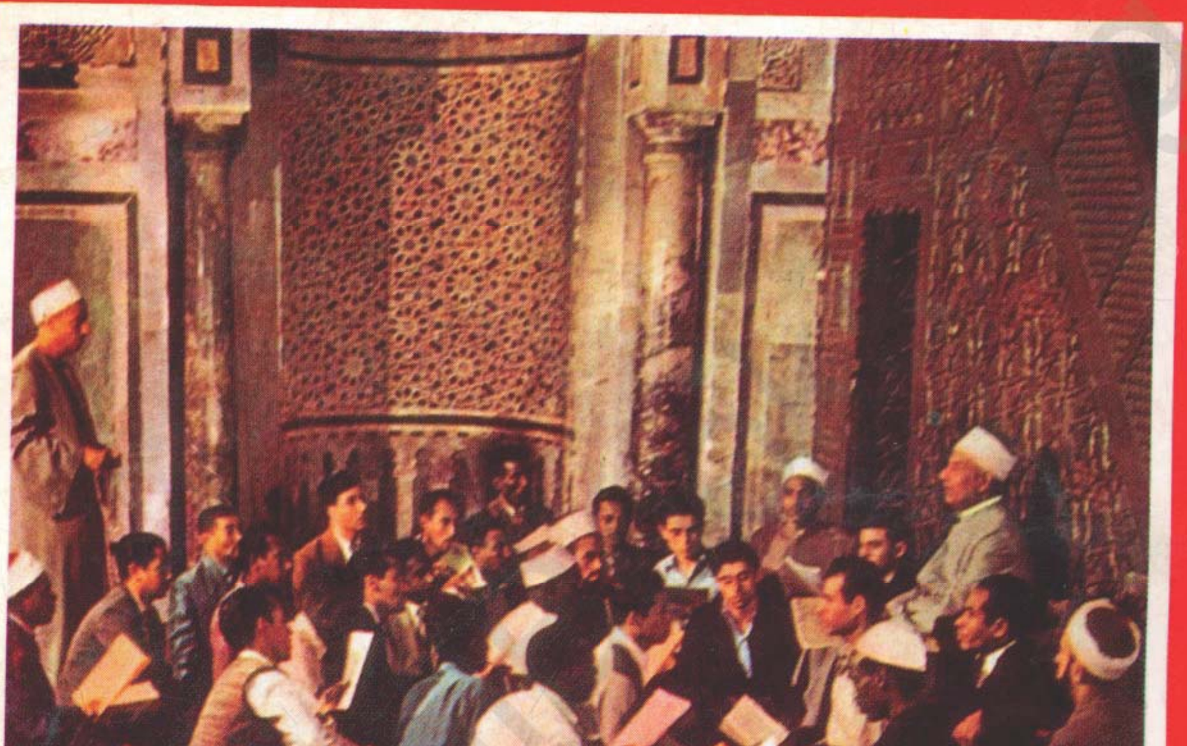

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم : رضی عابدی

(ناول)

جیون دھارا

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم: رضی عابدی

مشعل

آر۔بی 5 ' سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور 54600 ' پاکستان

MashalBooks.org

فہرست

دیباچہ
آخری مرد کی موت

افسانے

ایک سابق وزیر کی موت
جنت میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں
بند کمرے میں
مرد
وہ خچر نہیں تھا
سب سے بڑا جرم
اسے کسی نے بتایا ہی نہیں
''بیوٹی فل''
ایک آرٹسٹ دوست کے نام ذاتی خط
دو سہیلیاں
تصویر
مضمون

MashalBooks.org

تعارف

طٰہٰ حسین کی سوانح عمری عربی ادب کے شہ پاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ سوانح عمری ایک ناول کی شکل میں لکھی گئی ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ ناول نہ صرف ایک غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل شخصیت کی بتدریج نشو ونما کا ریکارڈ ہے بلکہ اس میں موجودہ صدی کے دور کے مصر میں طالب علموں کی زندگی کی ایک دل پذیر تصویر بھی ملتی ہے۔

مصنف نے اپنی زندگی کے شروع کے سال شمالی مصر کے اسی گاؤں میں گزارے جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنی سوانح کے پہلے حصے میں اپنی زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ نہایت دل سوز ہے، کیونکہ طٰہٰ حسین بچپن سے ہی نابینا تھا۔ ناول میں ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح اور کس دشواری سے وہ اپنے گردونواح کا شعور حاصل کرتا ہے اور کس طرح اس کے تخیل کی غیر معمولی نشو ونما اس کمی کو پورا کر دیتی ہے جو اسے نابینا ہونے کے باعث سہنا پڑی تھی۔ وہ سکول جاتا ہے اور عام لڑکوں کی طرح کھیل اور کام، کامیابی اور توہین کے تجربوں سے گزرتا ہے۔ وہ نہایت ہی کم عمر میں قرآن حفظ کر لیتا ہے۔ اس کی تمنائیں برآتی ہیں اور تیرہ سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ قاہراہ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ جہاں اسے الاظہر یونیورسٹی میں داخلہ مل جاتا ہے۔ سوانح عمری کی پہلی جلد یہاں ختم ہو جاتی ہے اور دوسری جو آپ کے ہاتھوں میں ہے شروع ہوتی ہے۔

اس زمانے میں الاظہر یونیورسٹی اپنی تاریخ کے ایک بحرانی دور سے گزر رہی تھی۔ یہ 970ء میں بنی تھی اور اس نے پہلے دور میں ہی اسلامی سٹڈیز کے سکول کی حیثیت

MashalBooks.org

سے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی ۔مشرق میں منگولوں کے حملے کے بعد اور مغرب میں اسلام کے زوال کے بعد عالم اسلام میں کوئی ادارہ نہیں تھا جو اس کی برابری کر سکے لیکن ترکی اور مملوکی حکومتوں کے دوران یعنی سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک جب اسلامی علوم کا عام طور پر انحطاط ہوا تو اظہر بھی اس سے نہیں بچ سکا اور یہاں ''علم'' فرسودہ اور گھسٹی پٹی تعلیمات کو دھرانے کا نام بن کر رہ گئی ۔ روایتی سائنس جن کی بنیاد الہاموں پر تھی اور اس لئے ان پر کوئی تنقید نہیں کی جا سکتی تھی ۔ وہ اظہری تعلیم میں مضبوطی سے جڑ پکڑ گئیں ۔ ان ''سائنسوں'' میں خاص طور پر چار تھیں ۔ (1) حدیث ۔ یہ علم کا وہ ذخیرہ ہے جو پیغمبر محمدﷺ اور ان کی تعلیمات کے متعلق قرآن کے بعد ہمارا سب سے اہم ذریعہ ہے ۔ حدیث کی تعلیم میں نہ صرف اصل عبارت کی چھان بین کرنا ہوتی ہے بلکہ ان مشتبہ تحریروں کی بھی جن کے توسط سے ہر حدیث ہم تک پہنچی ۔ (2) ۔تفسیر ۔یعنی قرآن کی ترجمانی ۔ (3) اولین اصول ۔یعنی قانون کے بنیادی اصول جو قانون کے چار سکولوں یا کٹر اسلام میں عبادت کے رسوم کے مابینہ مفاہمت کی بنیاد ہیں ۔(4) توحید ۔یعنی خدا کی وحدت کا فلسفہ ۔

''روایتی'' سائنسوں کے بعد نام نہاد ''عقلی'' سائنس آتی تھیں ، جن میں صرف ونحو، علم عروض ، صنعت کلام اور منطق شامل تھے ۔علم نجوم محض عملی مقاصد کیلئے پڑھایا جاتا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اس میں کسی قسم کی تخیلی آزادی کی گنجائش نہیں تھی ۔ دوسری طبیعاتی سائنس اور علم ریاضی جن میں ایک زمانے میں اسلام نے دنیا کی رہنمائی کی تھی ان کا بھی وہی حشر ہوا جو تاریخ ، جغرافیہ اور ادب کا ہوا اور وہ تقریباً غفلت کا شکار ہو گئیں ۔لیکن اٹھارہویں صدی کے بعد مغربی تہذیب کا مصر پر کسی نہ کسی طرح اثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور الاظہر بھی اس سے گہرے طور پر متاثر ہوا ۔ محمد علی اور اسماعیل پاشا دونوں نے اصلاحات کی کوششیں کیں لیکن ان کوششوں کو شیخوں کی اکثریت کی طرف سے زبردست رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا اور اس لئے وہ صرف محدود طور پر ہی کامیاب ہو سکیں ۔

لیکن انیسویں صدی کے آخری تیس سالوں میں مصر میں دو عظیم انسان ابھرے جنہوں نے مصری معاشرے کی زندگی اور سوچ پر دیرپا اثر ڈالا ۔ السید جمال الدین افغانی قاہرہ میں 1871ء میں پہنچے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مصر برطانوی اور فرانسیسی بنکوں کا زبردست طور پر مقروض ہونے کے باعث نہ صرف دیوالیہ ہوتا جا رہا تھا بلکہ اسکی خود مختاری

MashalBooks.org

کو بھی خطرہ تھا۔ جمال الدین کو پہلے ہی افغانستان، فارس، ہندوستان اور ترکی میں مسلم قوموں کی آزادی کے لئے جدوجہدیں کر چکا تھا، وہ اب مصری نوجوانوں کی تحریک کا دانشور رہنما بن گیا۔ گیارہ سال بعد، جب خود جمال الدین مصر سے جا چکا تھا، اسی مصری نوجوانوں کی تحریک نے عربی پاشا کی فوجی لیڈرشپ میں برطانوی قبضے کے خلاف ایک ناکام جدوجہد کی۔

جمال الدین مصر میں آٹھ سال رہا۔ اس دوران اسلام سائنسوں پر اپنی مہارت کی بنا پر اور ان سائنسوں کے مطالعے سے اس نے جدید عہد کے لئے جو نتائج اخذ کئے ان کی بنا پر اس نے اصلاح کی ایک بڑی تحریک شروع کی جو مصری زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوئی اور اس نے سماجی، سیاسی اور مذہبی غرض ہر پہلو کو اپنے دائرے میں لے لیا۔ 1879ء میں جب جمال الدین کو مصر سے ملک بدر کر دیا گیا تو اس تحریک کی لیڈرشپ اس کے دوست اور شاگرد محمد عبدو نے لے لی۔

جمال الدین کی شخصیت میں ایک بے قرار انقلابی کی روح تھی، جبکہ عبدو ایک باصبر لیکن تندہی سے کام کرنیوالا مصلح تھا۔ جمال الدین مصر میں آٹھ سال سے زیادہ نہیں رہا، جبکہ عبدو، جو ایک کسان کا بیٹا تھا، اس نے اپنی ساری زندگی اپنے آبائی وطن میں ہی گزاری۔ جمال الدین نے تو صرف اظہر کے دانشوروں کے ایک چھوٹے سے گروپ کو ہی متاثر کیا تھا گو مغرب زدہ افندیوں میں اس کے خیالات کو ایک زرخیز زمین ملی تھی۔ اس کے برخلاف حالانکہ عبدو مذہبی معاملات سے زیادہ سیکولر معاملات میں زیادہ بااثر تھا لیکن اس نے الاظہر میں اصلاحات کی سالہا سال کوشش کی کیونکہ اس کے خیال میں عام اسلام میں مذہبی اور سماجی اصلاح کی شروعات کیلئے اظہر کی بے حد اہمیت تھی۔

جمال الدین کے 1879ء میں مصر سے اخراج کے وقت عبدو کی عمر تیس سال تھی لیکن اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کا پہلے ہی اظہار ہو چکا تھا۔ شروع کے سالوں میں روایتی اسلامی سٹڈیز کے بنجر پن سے روگردانی کر کے تصوف کی طرف مائل ہو گیا تھا لیکن جمال الدین اسے دوبارہ حقیقی دنیا کی طرف کھینچ کر لایا، اس نے اسے مغربی خیالات سے روشناس کرایا اور اس کو مصر اور اسلام کے عصری مسائل سے دلچسپی دلائی۔ دراصل عبدو جمال الدین کا سب سے نمایاں شاگرد تھا اور اسی لئے اسے دارالعلوم سے ہٹا دیا گیا۔ یہ

اس وقت ہوا جب اس کے استاد کو ملک بدر کر دیا گیا تھا لیکن دوسرے سال ہی ایک نسبتاً زیادہ لبرل وزارت آئی تو اس نے عبدو کو سرکاری سرالے والوقائع المصریہ کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ عبدو نے اس رسالے کو اپنے پروگرام کا پھیلانے کا ذریعہ بنایا۔ اس پروگرام کا مقصد مسلم اقوام کی آزادی اور اسلام کی بتدریج اصلاح اور اس کا اخلاقی اور مذہبی تعلیم کے ذریعہ اندرونی طور پر احیاء تھا۔ اس کی بتدریجیت کے باعث عربی پاشا کی سرکردگی میں قوم پرست اور فوجی ذہنیت رکھنے والے عناصر کے ساتھ اس کی دوستی متزلزل رہی، حالانکہ اس نے ان کی اپنی بساط کے مطابق حمایت کی اور 1882 کی ناکام بغاوت کے بعد ان کے لیڈروں کے ساتھ جلاوطنی کی صعوبتیں بھی سہیں۔

1881ء میں عبدو کو جلاوطنی سے واپس بلا لیا گیا۔ اس کے بعد کے سترہ سالوں میں اس نے اپنی زندگی انتھک اور گوناگوں سرگرمیوں میں بسر کی۔ واپس آنے پر اس کو دیسی عدالتوں میں جج کے عہدہ پر فائز کیا گیا اور 1889 میں وہ مصر کا مفتی اعظم بنا دیا گیا۔ اس حیثیت میں اسے ملک میں اسلام کے Cannon law کی ترجمانی کرنے والوں میں اسے سب سے اونچا درجہ حاصل ہو گیا جس کو استعمال کر کے اس نے اسلامی قوانین میں اصلاح کرنے کا کام کیا۔ اس نے روایت کی بے سوچے سمجھے تقلید کرنے کی بجائے اس کی لبرل نقطہ نظر سے ترجمانی کی۔ اسی سال اسکو لجیسلیٹیو کونسل کا ممبر بنا دیا گیا۔ اس نے اس ادارے کو موثر بنانے کے لئے بھی بہت محنت کی کیونکہ اس کے خیال میں یورپی کنٹرول اور مشرقی ملوکیت دونوں سے چھٹکارا پانے اور آزادی اور جمہوری حکومت کے قیام کی طرف یہ ایک اہم پہلا قدم تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ عربی زبان کی اصطلاح کے لئے بھی کافی کام کر رہا تھا، جس کو وہ اسلامی احیاء کے لئے لازمی سمجھتا تھا۔

لیکن ہمارے لئے عبدو کی اہمیت ایک تعلیمی مصلح کی حیثیت سے سب سے زیادہ ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح اظہر کی مردہ روایت پرستی کو توڑ کر اس میں اسلام کے آغاز والی سادگی اور مستعدی کی روح پھونکی جائے اور اس کے ساتھ مغربی سائنس میں جو کچھ بھی سب سے عمدہ تھا اس کو شامل کیا جائے۔ اس کے ذہن میں مذہب اور سائنس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

آخر کار 1894ء میں اس کی کوششیں بظاہر بارآور ثابت ہوتی نظر آئیں اور

الاظہر کی اصلاح کے لئے اسکی رہنمائی میں ایک انتظامی کونسل کی تشکیل کی گئی لیکن قدامت پسندوں کی مخالفت جو عرصے سے زور پکڑ رہی تھی اب اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی اور محمد عبدو کے خلاف ایک تحریک چلائی گئی۔ نتیجہ کے طور پر اسے انتظامی کونسل سے دستبردار ہونا پڑا جس کے چند ماہ بعد وہ فوت ہوگیا۔

بہرحال عبدو کے بعد اس کے خیالات سے متاثر ہونے والوں نے اس کے کام کو جاری رکھا۔ ان میں سعد زاغلول (جس نے18-1914) کی جنگ کے بعد مصر کی آزادی کی تحریک کی رہنمائی کی)، قاسم امین (جو عورتوں کی آزادی کا علمبردار تھا) اور لطفی السید جو ایک لبرل صحافی اور سکالر تھا، ان کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ طہٰ کے ناول میں بھی ان کا ذکر ہے۔ ان لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ الاظہر کی اصلاح کی کوشش کرنا فضول ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے ایک علیحدہ سیکولر یونیورسٹی بنانے کی کوشش کی، جو مصر کی یونیورسٹی کے نام سے1908ء میں قائم ہوئی۔

طہٰ حسین کا ناول جن سالوں کا احاطہ کرتا ہے وہ 1902 اور1910 کے درمیان کے یہ زبردست اہمیت رکھنے والے سال ہی ہیں۔ طہٰ اظہر میں اس وقت پہنچا جب کہ محمد عبدو (جس کو ناول میں ''امام'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے) وہاں پڑھا رہا تھا۔ طہٰ امام سے ذاتی طور پر کبھی نہیں ملا لیکن اس کی کتاب شروع سے آخر تک ہمیں عبدو کی زبردست اہمیت، عزت اور اثر کا احساس ملتا ہے۔ طہٰ کی الاظہر سے مایوسی نے اسے پہلے تو مرصفی جیسے لبرل شیخوں کی طرف مائل کیا، پھر اظہر کے باہر ان ''طربوش پوشوں'' کی طرف جن میں اسے امام کے حقیقی پیرو ملے۔

مصر کی ثقافت میں جدید تحریک کا خلاصہ ذکر کرنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس ناول کے آخری ابواب کی وسیع تر اہمیت کو سمجھا جا سکے۔ جیسا کہ ایک ریویو کرنے والے نے کہا ان ابواب میں پندرہویں صدی کی یورپی یونیورسٹیوں میں ہیومنزم اور مذہبی روایت پرستی کے درمیان ہونے والے ٹکراؤ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

بہرحال اس ناول کی عظمت صرف سماجی یا تاریخی اعتبار سے ہی نہیں ہے بلکہ بچپن اور نوجوانی کی ایسی (تحریری) تصویروں کے باعث ہے جو بیک وقت مصری بھی ہیں اور آفاقی بھی۔ جیسے جیسے طہٰ حسین کی زندگی کا دھارا بہتا جاتا ہے ہم اس میں خود اپنی زندگی

MashalBooks.org

کا عکس دیکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انسانی فطرت کو گہرے طور پر سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں جو ہمارے شعور میں بھی اضافہ کرتی ہے لیکن اداس کیے بغیر بھی نہیں رہتی۔

ہلری ویمنٹ (کچھ ترامیم کے ساتھ)

MashalBooks.org

ا

ابتدائی دو تین ہفتوں میں وہ قاہرہ میں جیسے کھو سا گیا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ دیہات کو چھوڑ کر دارالحکومت میں آ گیا تھا اور الاظہر میں باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہ حواس کے بجائے صرف تخیل کے زور پر دن کے تین بدلتے ہوئے پہروں میں فرق کر سکتا تھا۔

وہ گھر جہاں وہ رہتا تھا اور اس کی طرف جانے والا راستہ دونوں اس کے لئے غیر مانوس اور اجنبی تھے۔ جب وہ الاظہر سے واپس آتا تو دائیں جانب ایک دروازے میں سے ہو کر گزرتا جو دن میں کھلا رہتا اور رات کو بند ہو جاتا۔ مغرب کے بعد اس کے دروازے میں ایک چھوٹا سا راستہ کھلا رہتا۔ اس میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے دائیں رخسار پر ہلکی سی گرمی محسوس ہوتی اور لطیف سا دھواں اس کی ناک کو گدگداتا جبکہ بائیں طرف سے اسے قلقل کی سی آواز آتی جس سے وہ حیران بھی ہوتا اور جو اسے اچھی بھی لگتی تھی۔

کئی روز تک صبح شام وہ اس آواز کو بڑے تجسس سے سنتا لیکن اس میں ہمت نہیں تھی کہ پوچھ سکے کہ یہ کیا ہے۔ پھر ایک دن اسے کسی کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ یہ آواز ایک قسم کے حقے سے آتی ہے جو اس علاقہ کے تاجر پیتے ہیں۔ قہوہ خانہ کا مالک انہیں یہ مہیا کرتا تھا اور اسی میں سے وہ ہلکی سی حرارت اور لطیف سا دھواں اٹھتا تھا۔

وہ کچھ قدم بالکل سیدھا چلتا رہتا۔ یہاں تک کہ وہ ایک سیلی سی، ڈھلوان سی جگہ پر پہنچ جاتا جہاں قہوہ خانہ کے کیچڑ کے جمع ہونے کی وجہ سے قدم جمانا مشکل تھا۔ پھر وہ ایک کھلے راستہ پر نکل آتا لیکن یہ بہت تنگ اور گندہ تھا اور اس میں سے عجیب قسم کی بدبوئیں اٹھتی رہتیں۔ جو صبح سویرے تو اتنی متعفن نہیں ہوتی تھیں اور نہ ہی شام ڈھلے۔ لیکن جوں جوں دن چڑھتا جاتا اور سورج کی گرمی تیز ہو جاتی تو یہ ناقابل برداشت ہو جاتیں۔

وہ اس تنگ راستے سے سیدھا گزر جاتا لیکن بہت کم ایسا ہوا کہ اسے یہ راستہ ہموار اور آسان لگا ہو۔ اکثر اس کا دوست اسے ادھر ادھر دھکیلتا رہتا تا کہ اسے کوئی ٹھوکر وغیرہ نہ لگے۔ پھر وہ نئے رخ پر چل پڑتا اور دائیں یا بائیں ایک مکان کی طرف راستہ ٹٹولتا ہوا رکاوٹوں سے نکل جاتا اور پھر اس پرانی سمت مڑ جاتا۔ وہ بڑی تیزی سے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے دوست کے ساتھ ساتھ غلیظ بوؤں کو سونگھتا ہوا چلتا رہتا۔ ہر طرف سے آنے والی بے ہنگم آوازیں اس کے کانوں کے پردے پھاڑ دیتیں اور نیچے دائیں بائیں سے آتی ہوئی یہ آوازیں جیسے اس کے سر کے اوپر ہوا میں اکٹھی ہو جاتیں اور تہہ در تہہ ایک لطیف دھند کی سی شکل اختیار کر لیتیں۔

دراصل ان آوازوں میں بڑا تنوع تھا۔ جھگڑتی ہوئی عورتوں کی بلند ہوتی ہوئی آوازیں غصہ میں بھری ہوئی یا آرام سے گفتگو کرتی ہوئی مردوں کی آوازیں، سامان اتارنے اور چڑھانے کی آوازیں، سقے کی بولیاں، گدھے گھوڑے یا خچر کو گالیاں دیتے ہوئے ریڑھے والے اور پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور کبھی کبھی آوازوں کا یہ ہنگامہ کسی گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں یا کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ سے ٹوٹ جاتا۔

جب وہ اس شور وغل سے گزرتا تو اسکے خیالات دور کہیں اور ہوتے اور نہ ہی اسے اپنے وجود کا احساس ہوتا نہ ہی اپنی حرکتوں کا دھیان۔ لیکن سڑک پر ایک خاص جگہ پہنچ کر اسے اپنے بائیں جانب ایک آدھ کھلے دروازے میں سے بات چیت کی بے ہنگم سی آوازیں آتیں۔ پھر وہ جان جاتا کہ ایک دو قدم آگے جا کر اسے بائیں طرف ایک زینہ پر چڑھنا ہے جو اس کے گھر تک جاتا ہے۔

یہ ایک معمولی سا زینہ تھا۔ نہ چوڑا نہ تنگ۔ سیڑھیاں پتھر کی تھیں لیکن چونکہ یہ کثرت سے استعمال ہوتا اترنے کے لئے بھی چڑھنے کے لئے بھی اور کوئی اسے دھونے یا صاف کرنے کی تکلیف نہیں کرتا تھا۔ اس لئے اس پر گندگی کی موٹی تہہ جم جاتی اور سیڑھیوں پر سخت پتھر کی طرح جمع ہو جاتی۔ یوں سیڑھیوں کے پتھر پوری طرح ڈھک جاتے اور چاہے آپ نیچے جائیں یا اوپر یہ زینہ مٹی کا بنا ہوا لگتا تھا۔

جب بھی لڑکا زینہ اترتا یا چڑھتا تو وہ اپنے قدم گنتا رہتا لیکن برسوں اس جگہ رہنے کے باوجود اور زینہ کے ان گنت چکر لگانے کے باوجود کبھی اس کے ذہن میں یہ نہ آیا

MashalBooks.org

کہ سیڑھیوں کو گنے۔ دوسری یا تیسری بار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے معلوم ہوا کہ کچھ قدم چلنے کے بعد اسے تھوڑا سا بائیں طرف مڑنا ہوتا تھا اور پھر باقی سیڑھیاں چڑھنی ہوتی تھیں۔ درمیان میں ایک راستہ دائیں طرف آتا مگر وہ اس میں کبھی نہیں گیا۔ گو اسے معلوم تھا کہ یہ اس عمارت کی پہلی منزل کو جاتا تھا جس میں وہ اتنے برسوں سے رہ رہا تھا۔

اس منزل پر طلباء نہیں رہتے تھے بلکہ یہاں مزدوروں اور تاجروں کا ڈیرہ تھا۔ دائیں طرف کے دروازہ کو چھوڑ کر وہ دوسری منزل پر چڑھ جاتا۔ یہاں اس کی پریشان روح کو آرام اور سکون ملتا۔ تازہ ہوا کے جھونکے پھیپھڑوں سے اس حبس کو نکال دیتے جس سے اس گندے زینہ پر اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ پھر وہاں طوطا بھی تھا جو بے تکان سیٹیاں بجاتا رہتا گویا ساری دنیا کے سامنے اپنے ایرانی مالک کے ظلم کا اعلان کر رہا ہو جس نے اسے ایک گندے سے پنجرے میں بند کیا ہوا تھا اور جو اسے کل نہیں تو پرسوں کسی ایسے آدمی کے ہاتھوں فروخت کرنے والا تھا جو اس کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتا اور جب وہ اس سے چھٹکارا پا کر رقم مٹھی میں لے لیتا تو پھر ایسے ہی ایک اور طوطے کو پکڑ کر وہ اس غلیظ پنجرے میں ڈال دیتا جو اس طرح اپنے مالک کے خلاف شور کرتا اور اپنے فروخت ہونے کا انتظار کرتا رہتا۔ اس ہاتھ سے اس ہاتھ، اس پنجرے سے اس پنجرے، جہاں بھی وہ جاتا اس کے نالے مردوں اور عورتوں کے دلوں کو خوش کرتے۔

ہمارا دوست جب زینے کے سرے پر پہنچا تو اس نے اپنے چہرے کو چھوتی ہوئی تازہ ہوا کو اندر کھینچا اور طوطے کی آواز سنی جو اسے دائیں طرف بلا رہی تھی۔ اس نے لبیک کہا اور ایک تنگ برآمدے میں سے ہو کر ان دو کمروں کے آگے سے گزرا جن میں دو ایرانی رہتے تھے۔ ان میں سے ایک ابھی جواں تھا جبکہ دوسرا ادھیڑ عمر کو پہنچ چکا تھا۔ ایک اتنا ہی اداس اور آدم بیزار تھا جتنا دوسرا شوخ اور خوش طبع۔

آخر لڑکا گھر پہنچ گیا۔ ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوا جس میں کچھ گھریلو ضروریات مہیا تھیں۔ اس کے آگے ایک اور کمرہ تھا۔ کشادہ لیکن بے ہنگم جو بجلی اور علمی مقاصد کے لئے کام آتا تھا۔ یہ خواب گاہ، طعام گاہ، مطالعہ کا کمرہ اور بیٹھک سب کچھ تھا۔ یہاں کتابیں تھیں، برتن تھے اور کھانے کی چیزیں تھیں اور یہاں اس کا اپنا ایک مخصوص گوشہ بھی تھا جیسا کہ ہر اس کمرہ میں ہوجاتا جہاں وہ رہتا یا اکثر جایا کرتا۔

MashalBooks.org

یہ مخصوص گوشہ دروازے کے پیچھے بائیں طرف تھا۔ایک دو قدم آگے زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی اوراس پر ایک پرانا قابل استعمال قالین تھا دن میں وہی ہاں بیٹھتا اور رات کو یہاں سوتا۔ایک تکیہ اس کے سر کے نیچے ہوتا اوراوڑھنے کے لئے ایک کمبل۔ کمرے کے دوسری طرف بڑے بھائی کا علاقہ تھا جواسکی جگہ سے کسی قدر بلند تھا اس نے بھی نیچے چٹائی بچھائی ہوئی تھی جس پر ایک عمدہ قالین تھا۔ پھر ایک گدہ اوراس کے اوپر بڑا سا کشادہ بستر جس میں روئی بھری تھی اور سب سے زیادہ یہ کہ اس پر ایک غلاف بھی تھا۔ یہاں نوجوان شیخ اپنے قریبی دوستوں کے ساتھ بیٹھتا۔انہیں دیوار کے ساتھ کمر نہیں لگانی پڑتی تھی، جیسا کہ لڑکا بیٹھتا تھا بلکہ یہاں قالین پر اوپر نیچے تکیے لگے ہوئے تھے۔ رات کے وقت یہ گدہ بستر بن جاتا تھا جس پر شیخ سوتا تھا۔

MashalBooks.org

۲

لڑکے کو اپنے گرد و پیش کا بس اتنا ہی اندازہ تھا۔ اس کی زندگی کے دوسرے دور کا تعلق گھر اور الاظہر کے درمیان اس کے ہنگامہ خیز سفر تھے۔ وہ چھتے سے باہر نکلتا۔ قہوہ خانہ کی گرمی اس کے بائیں رخسار پر محسوس ہوتی اور دائیں طرف سے اسے حقہ کی گڑگڑ کی آواز سنائی دیتی۔ سامنے ایک دوکان تھی جس کا اس کی زندگی میں اہم حصہ تھا۔ یہ الحاج فیروز کی دوکان تھی جو آس پاس کے علاقوں میں اکثر ضروریات زندگی کی سپلائی کرتا تھا۔ صبح کے وقت وہ ابلے ہوئے لوبیے کی پھلیاں بیچتا تھا۔ جو مختلف روائتی طریقوں سے تیار کی جاتی تھیں لیکن الحاج فیروز ان کے خواص کا بڑے فخر سے ذکر کرتا اور اسی حساب سے ان کی قیمت میں اضافہ کر دیتا۔ اس کے پاس سادہ چربی میں بنا ہوا، مکھن میں تلا ہوا اور طرح طرح کے تیل میں تیار کیا ہوا لوبیا ہوتا اور فرمائش کے مطابق وہ ان میں ہر طرح کے مصالحہ بھی ملا دیتا تھا۔ جہاں تک طالب علموں کا تعلق تھا انہیں لوبیا بہت پسند تھا اور اکثر وہ بہت سا کھا جاتے تھے جس کی وجہ سے دوپہر تک ان کا سر بھاری رہتا اور دوپہر کے لیکچر کے وقت وہ سو جاتے۔

شام ہوتی تو الحاج فیروز اپنے گاہکوں کو کھانا فروخت کرتا، جس میں پنیر، زیتون، پسے ہوئے سیم کے بیج یا شہد شامل ہوتے۔ زیادہ شوقین لوگوں کو وہ مچھلیوں کے ڈبے بھی مہیا کرتا اور غالباً چند کو دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ ایسی چیزیں بھی بیچتا جس کا کوئی نام نہیں تھا اور جن کا کھانے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ چیزیں جن کا بہت چپکے چپکے نام لیا جاتا ہے اور جنہیں بڑی شدت سے چاہا جاتا ہے۔

یہ دھیمی دھیمی باتیں لڑکے کے کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی اسے کچھ کچھ سمجھ بھی آتا لیکن عموماً یہ سارا کاروبار اس کیلئے ایک راز تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور وہ بڑا ہوتا گیا تو اسے ان اشاروں کا مطلب سمجھ میں آنے لگا اور یہ مخمصے اس پر کھلنے لگے۔ اسے اب جو کچھ معلوم ہوا اس سے اچھائی اور برائی کے اس کے معیار متاثر ہوئے اور لوگوں اور چیزوں کے متعلق اس کے اندازے بدل گئے۔

الحاج فیروز ایک لمبا تڑنگا کالا بھجنگ آدمی تھا اور کسی حد تک کم گو تھا لیکن جب وہ بولتا تھا تو لفظ صاف نہیں ہوتے تھے اور وہ غربی کو اس طرح تتلا کے بولتا تھا کہ آج تک لڑکے کے ذہن پر اس کی گفتگو کا نقش باقی ہے۔ وہ ہمیشہ اسے البیان والتبیین میں زیاد اور اس کے شاگرد کی کہانی یاد دلاتا تھا۔ زیاد نے اپنے شاگرد سے کہا کہ وہ یہ فقرہ بولے۔ ''ہمیں ایک خچر دیا گیا۔'' لڑکے نے یہ فقرہ یوں دہرایا۔ ''ہمیں ایک چچر دیا گیا۔'' ''بدبخت'' زیاد نے غصہ سے کہا۔ ''اگر تو خچر نہیں کہہ سکتا تو اس کی جگہ گھوڑا کہہ لے۔'' اس پر لڑکے نے جواب دیا ''ہمیں ایک گورا دیا گیا'' زیادہ سخت جز بز ہوا اور اس نے چچر کو ہی غنیمت جانا۔

الحاج فیروز کو اس علاقہ میں اور خصوصاً طالب علموں کے درمیان ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ جب مہینے کے آخر میں ان کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تو وہ اسی کے پاس بھاگے بھاگے آتے یا پھر اس وقت آتے جب ان کے پیسے آنے میں دیر ہو جاتی۔ وہی انہیں کھانا ادھار دیتا۔ کبھی کبھی ایک دو روپے بھی قرض دے دیتا اور ہر قسم کی مشکل میں ان کی مدد کرتا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ اکثر وہ اسی طرح ان کا ذکر کرتے تھے۔ جیسے الاظہر کے جید شیوخ کا۔

صرف اتنا ہی نہیں تھا ایک اور طرح بھی الحاج فیروز طالب علموں کیلئے بہت اہم تھا۔ اسی کے پتہ پر ان کے گھروں سے خط آتے اور تڑے مڑے نوٹ آتے جنہیں لے کر وہ ڈاک خانہ جاتے اور وہاں سے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی جیبیں لے کر لوٹتے جس کی جھنکار سے ان کے کان اور دل جھوم اٹھتے۔

قدرتی بات تھی کہ کوئی بھی طالب علم الحاج فیروز کی دوکان پر صبح یا شام دن کا کوئی بھی وقت گزارنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ یا پھر کم از کم اس جگہ پر ایک اچٹتی

MashalBooks.org